نقد واستدراک

مولانا ابوالکلام آزاد

تحقیقات اسلامی کے گذشتہ شمارہ میں پروفیسر عبدالمغنی صاحب کے مضمون پر جناب سید امین الحسن رضوی اور پروفیسر محمد سلیم صاحب کی تنقید شائع ہوئی تھی۔ ذیل کے صفحات میں پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے ان کا جواب دیا ہے۔ اس کے بعد جواب الجواب کی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوتی اس لئے اس کا سلسلہ بند کیا جاتا ہے۔ البتہ مولانا آزاد مرحوم کے فکر و فلسفہ اور دینی و سیاسی عمل سے متعلق مثبت انداز کی تحریروں کے لئے تحقیقات اسلامی کے صفحات حاضر ہیں۔

(جلال الدین)

(۱)

جولائی تا ستمبر ۱۹۹۱ء کے "تحقیقات اسلامی" میں مندرجہ بالا عنوان سے امین الحسن رضوی صاحب کے جو تاثرات شائع ہوئے ہیں وہ کسی علمی تجزیے پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ ان میں صرف ذاتی قسم کے تبصرے کیے گئے ہیں جن پر بحث کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی' اس لیے کہ ہر شخص کا اپنا اپنا خیال ہے' جو اس کی اپنی ہمّت و بصیرت کے مطابق ہوتا ہے۔ بہر حال' صرف چند باتیں میں عرض کرنی چاہتا ہوں' تاکہ قارئین کے سامنے بعض امور کی وضاحت ہو جائے۔

تحقیقات اسلامی کے گزشتہ شمارے میں شائع ہونے والا میرا مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد کی عظمت" رضوی صاحب کے خیال میں "تحقیقات کے معیار سے فروتر ہے"۔ ظاہر ہے کہ اپنی اس رائے کے لئے رضوی صاحب کے پاس مدیر تحقیقات اسلامی کے معیار سے بلند تر کوئی معیار ہوگا اور امید ہے کہ خود ساختہ نہیں ہوگا، گرچہ مشکل یہ ہے کہ میرا مضمون شائع ہو چکا ہے اور میں اس پر نظر ثانی کرنے

کے لیے بھی تیار نہیں ہوں' اس لیے کہ وہ میں نے اپنے معیار سے لکھا ہے جو علم و ادب کی دنیا میں کسی حد تک معروف ہے۔

مولانا مودودی کے تعزیتی پیغام کو کوئی "قضیہ" میں نے نہیں بنایا ہے یہ قضیہ قضایا تو رضوی صاحب فرمارہے ہیں۔ جہاں تک بحیثیت عالم دین مولانا آزاد کی قدر کا تعلق ہے وہ ہر اس شخص کو معلوم ہے جس نے مولانا مودودی کی کتاب "تجدید واحیائے دین" پڑھی ہے۔ ہوسکے تو رضوی صاحب بھی ایک بار اسے پڑھ لیں۔

پاکستان کی قرارداد مقاصد کا جو قضیہ رضوی صاحب نے چھیڑا ہے وہ ان کے زرخیز ذہن کی پیداوار ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ اس موضوع پر میرے ساتھ ان کی گفت وگو ہوئی ہو۔ ریڈینس میں یہ کارستانی انہوں نے کب کی' اس کا کوئی ریکارڈ میرے پاس نہیں۔ بس ایک بار ایک موضوع پر رضوی صاحب سے میری بحث ہوئی تھی۔ وہ اسلامی تاریخ میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کا معاملہ تھا۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں وہی موقف اختیار کیا تھا جو "خلافت و ملوکیت" میں مولانا مودودی نے پیش کیا ہے' جب کہ رضوی صاحب کو شدومد سے اصرار تھا کہ اس سلسلے میں عباسی کا موقف صحیح ہے اور مولانا مودودی کا غلط۔ میں نے رضوی صاحب سے پوچھا تھا کہ مولانا مودودی نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اسلامیات (قرآن وحدیث وسیرت وفقہ وغیرہ) کے جن ماخذ کا حوالہ دیا ہے کیا وہ رضوی صاحب کی نظر میں ہیں؟ اس کا جواب ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ عباسی کے قائل ہیں' یعنی انہوں نے اپنے خاص معیار سے مولانا مودودی کی تصنیف پر عباسی کی تصنیف کو ترجیح دی تھی!

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کے معاملات پر جو تبصرہ رضوی صاحب نے کیا ہے وہ ان متواتر روایات اور واقعات کے خلاف ہے جن سے ہندوستان اور پاکستان کے باخبر حضرات واقف ہیں۔ مولانا آزاد پر یہ تہمت کہ انہوں نے مسلم یونیورسٹی سے انتقام لیا کوئی سنجیدہ' ذمے دار اور صاحب علم شخص نہیں لگاسکتا۔ آزاد ہندوستان کے ابتدائی زمانے میں مولانا آزاد نے دیگر ملی اثاثوں (دارالمصنفین' انجمن ترقی اردو ہند' مدرسہ عالیہ کلکتہ وغیرہ) کے ساتھ مسلم یونیورسٹی

کے بھی تحفظ کا جو سامان کیا وہ ان کا ایک تاریخی کارنامہ تھا جب کہ آزادی سے قبل یقیناً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کچھ گم راہ طلبہ نے ان کے ساتھ سخت بدتمیزی کی تھی۔ کیا آج تک کوئی غیر مسلم آزاد ہندوستان میں مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوا ہے؟ اگر نہیں ہوا ہے تو "تاریخ کا فیصلہ" یہ ہے، نہ کہ وہ جو رضوی صاحب تاریخ کی طرف سے فرمارہے ہیں!

مولانا آزاد کی دینی وملی خدمات کو "۲۰ء یا زیادہ سے زیادہ ۲۲ء" تک جو رضوی صاحب نے محدود کردیا ہے وہ ان کی واقفیت کا شاہکار ہے، اس لیے کہ مولانا آزاد کا ایک اہم ترین دینی کارنامہ "تفسیر قرآن بہ عنوان "ترجمان القرآن" رضوی صاحب کے مقرر کردہ دور کے بعد ہی کی چیز ہے اور وہ ان کے بیان کے مطابق گویا دینی خدمت کے دائرے سے خارج ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں رضوی صاحب نے ظلم وزیادتی کی حد کردی ہے کہ ۲۲ء کے بعد "اسلام اور مسلمانوں کے فروغ میں" نہ صرف یہ کہ وہ مولانا آزاد کا کوئی Contribution تسلیم نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ "معاملہ کچھ الٹا ہی نظر آتا ہے"۔ ایسی غلط اور گم راہ کن بات کوئی معقول انسان نہیں کرسکتا۔ اس سے تو صرف یہ محسوس ہوتا ہے کہ رضوی صاحب کو مولانا آزاد سے کوئی بغض وعناد ہے اور ان کے دل ودماغ مولانا کے خلاف تعصبات سے بھرے ہوئے ہیں۔

میں نے مولانا آزاد کے تصور انانیت کا جو موازنہ اقبال کے تصور خودی کے ساتھ کیا ہے وہ "غبار خاطر" کے حوالے سے ہے۔ رضوی صاحب جی کڑا کرکے ایک بار غبار خاطر کھلے دماغ سے پڑھ لیں۔ یہ موازنہ بھی میں نے ایک جہت سے کیا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کا کوئی فلسفۂ خودی اقبال کی طرح نہیں ہے اور نہ ظاہر ہے کہ یہ میرا مقصد ہے یا ہوسکتا ہے کہ مولانا نے خودی کا ایک باضابطہ فلسفہ پیش کیا تھا۔

جناب ماہر القادری مرحوم کے متعلق میں نے جو بات جس سیاق وسباق میں کہی ہے وہ میرے خیال میں بالکل صحیح ہے، ماہر القادری صاحب اور مولانا آزاد کے درمیان کسی موازنے کی بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتا، اس لیے کہ علم کے معاملے

یں دونوں کی دنیا الگ الگ ہے۔

مولانا آزاد نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے جو کچھ کیا اس پر بہت زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ مولانا محتاج تعارف ہیں نہ ان کا کام۔ تاریخ اور علم وادب کی کتابیں مولانا کی خدمات اور ان کے کمالات کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں۔ جس شخص کو مولانا کے کاموں کی قدر معلوم نہیں اس کے متعلق تو بس غالب کا یہ شعر ہی نقل کیا جاسکتا ہے :

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

میں نے اس سلسلے میں جو بات کی ہے وہ ہرگز "بے بنیاد و بلا ثبوت" نہیں ہے، زیر بحث مضمون میں بھی میں نے دلیلیں دی ہیں اور اپنی کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد ـــــ ذہن وکردار" میں بھی اس موضوع پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کے کچھ حوالے زیر نظر مضمون میں بھی ہیں۔

رہی آخر تک مولانا آزاد کی عالمانہ زندگی، تو اس کا شاہد ایک زمانہ ہے اور بے شمار انسان اس حقیقت کو جانتے مانتے ہیں۔

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

(۲)

پروفیسر محمد سلیم نے اپنے تبصرے میں کچھ تمہیدی نکات کے ساتھ صرف ایک سوال اٹھایا ہے، جو میں سمجھتا ہوں کہ ایک سنجیدہ علمی سوال ہے اور اس پر غور کیا جانا چاہئے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ میں نے متعلقہ امر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا آزاد کے ذہن کی ترجمانی ہے، نہ کہ میرے کسی تصور کی۔ اس لئے میں نے "گویا" کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی یہ میرا قیاس ہے کہ شاید مولانا نے ایسا سمجھا ہو۔ یہ بات میں نے خاص کر اس لئے کہی کہ مولانا نے اپنے مشن کو ترک کرنے کا اعلان کبھی نہیں کیا بلکہ لوگوں کے استفسا پر بھی تاثر دیا کہ وہ اپنے اوّلین مقاصد کے حصول کے لئے ایک طریق کار اختیار

کر رہے ہیں، اس لیے کہ غلامی کے دور میں ان کے نزدیک سب سے پہلے آزادی ضروری تھی اور اس کے لئے وہ غیر مسلم اہل وطن کے ساتھ تحریک آزادی میں شرکت ضروری سمجھتے تھے۔ یہ خیال محض مولانا آزاد کا نہیں تھا بلکہ اکثر علماء اس کے قائل تھے، خصوصاً اہل دیوبند اس میں پیش پیش تھے اور ۲۰ء سے ۲۵ء تک علماء کے حلقے میں مولانا آزاد کے سیاسی موقف پر کوئی اعتراض گویا نہیں ہوا۔ اس کے بعد جیسے جیسے کانگریس اور لیگ کی کش مکش بڑھتی گئی، مولانا کے کانگریس کے ساتھ وابستہ ہونے کے سبب مسلمانوں کے بعض حلقوں میں ان پر اعتراض بڑھتا گیا، حالاں کہ انھوں نے دونوں سیاسی جماعتوں کے درمیان مفاہمت اور مسلمانوں کے جائز مفادات کے تحفظ کی پوری کوشش کی۔

رہی بات انانیت کی، تو یہ صرف ایک بدگمانی ہے، ورنہ اگر نیتوں کا تجسس کیا جانے لگے تو شاید ہی کوئی شخص اعتراض سے محفوظ رہے۔ مولانا آزاد کی انانیت کیا مسٹر جناح کی انانیت سے بڑی تھی؟ یہ صرف ایک مثال ہے۔ میں تو مسٹر جناح پر بھی انانیت کا الزام لگانے کے لئے تیار نہیں ہوں، حالاں کہ اکثر مورخین ایسا کرتے ہیں۔ مسٹر جناح کا اپنا ایک موقف تھا اور اس میں وہ مخلص تھے۔ مولانا آزاد بھی یقیناً اپنے موقف کے سلسلے میں مخلص ہی تھے۔ انہیں اس کے صحیح ہونے پر اتنا ہی اعتماد تھا اور وہ اسے مسلمانوں کے لئے اتنا ہی مفید تصور کرتے تھے جتنا مسٹر جناح اپنے موقف کو۔ تاریخ نے ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا ہے کہ دونوں میں کس کا موقف برصغیر کے مسلمانوں کے مسئلے کے حل کے لئے زیادہ صحیح اور مفید تھا۔ دلائل اور شواہد دونوں طرف تھے اور ہیں۔ آج پاکستان نیز ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ تقسیم ہند کو ایک سوالیہ نشان بنانے کے لئے کافی ہے ایسی حالت میں مولانا آزاد کے موقف کے غلط ہونے پر اصرار بہت معقول بات نہیں ہے۔ انصاف سے کام لے کر ہر چیز کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کو دیکھنا چاہیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مسٹر جناح اور مولانا آزاد دونوں نے اپنے اپنے طور پر اسلام اور مسلمانوں کے فروغ و فلاح کے لئے اقدامات کیے۔

جہاں تک حکومت الٰہیہ کا معاملہ ہے، یہ ایک نازک موضوع ہے جماعت اسلامی

ہند نے اس کی نزاکت کے مد نظر ہی اقامت دین کی اصطلاح اختیار کی۔ مولانا مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے پاکستان میں نظام مصطفی کے محاذ پر ان جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کیا جن کا نظریہ واضح طور پر حکومت الٰہیہ کا قیام کم از کم ان معنوں میں نہیں تھا جو جماعت اسلامی پاکستان کے مد نظر ہے۔ اس طرح دین کے قیام و نظام اور تحفظ و فروغ کے لئے مختلف مواقع و مراحل پر مختلف تدبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے تو قدیم مصر کی ایک باطل حکومت کے دور میں بھی 'خواہ اپنی ہی شرطوں پر' ایک اہم اور شاید اہم ترین منصب قبول کیا تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے جو حالات اس کے تشکیلی دور میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک تھے ان میں مولانا آزاد اگر واشگاف طور پر حکومت الٰہیہ کا علم بلند کرتے تو ان کو دستور ہند میں مسلمانوں کے لئے عام شہری کی حیثیت سے برابری کے وہ حقوق حاصل کرنے کا موقع شاید نہیں ملتا جن کے حوالے دے کر آج بھی مسلمان ہندوستان میں اپنی بقا کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سیاسی سطح پر جماعت اسلامی ہند کا طرز عمل صورت حال کی حقیقت اور اقامت دین کے عملی مراحل کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔

مشترک خاندانی نظام اور اسلام

از: سلطان احمد اصلاحی

مشترک خاندانی نظام ہندوستان اور تیسری دنیا کے ملکوں کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس رسالہ میں اسلام کے نقطۂ نظر سے اسی اہم مسئلہ سے بحث کی گئی ہے۔ رسالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں مشترک خاندانی نظام کے محرکات اور اس کے نقصانات کی سماجی، معاشی اور نفسیاتی سبھی پہلوؤں سے تفصیل ہے۔ دوسرے حصے میں اس نظام کے برعکس اسلام کے مطلوبہ خاندانی نظام کے خدوخال، اس کے مستند ماخذ کی روشنی میں دلائل کے ساتھ واضح کیے گئے ہیں۔ رسالہ علمی اور تحقیقی ہے اور کوئی بات بغیر حوالہ کے نہیں کہی گئی ہے۔

صفحات ۵۶ آفسٹ کی حسین طباعت۔ قیمت صرف ۶ روپئے

ناشر: مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ